سیّدہ افصح عابد

مغلیہ عہد میں جاگیرداری نظام کا عروج اور اُردو شاعری پر اثرات

Article expresses the meaning and system of feudalism in the Mughal period. Poetry has been afected by its contemporary social conditions and variants in the form of obedience and flattery. In this article we discuss the effect of feudalism in "The era of Mughal's".

''فیوڈل ازم کا لفظ فیو (Feu) فیوڈ (Feud) یا فیوڈم (Feudum) سے نکلا ہے یہ ایک جائیداد کی شکل تھی کہ جس کا ذکر قرونِ وسطیٰ کی قانون کی کتابوں میں ہے۔ فرانسیسی زبان میں یہ لفظ فیودا لیتے (Feodalite) ہو گیا اس سے پہلے اس مفہوم کو فیف (Feief) کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا''۔[۱]

فیوڈل ازم کی اصطلاح کو بحیثیت معنی وسیع گردانتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی جب ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو ''جاگیرداری'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔[۲]

''اُردو دائرہ المعارف اسلامیہ'' میں جاگیر سے متعلق درج ہے کہ: ''وہ اراضی جو ہندوستان میں حکومت کی طرف سے افراد کو بطور وظیفہ یا ان کی فوجی خدمات کے صلے میں بطور انعام عطا یا تفویض کی جاتی تھیں۔ جاگیردار اس اراضی پر مالیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوتا تھا''۔[۳]

نوراللغات (حصہ اوّل) میں مولوی نورالحسن نیر مرحوم جاگیر اور جاگیردار سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

جاگیر۔۔۔ یہ لفظ سلاطین ہند کے درباریوں اور اہل دفتر کی اصطلاح ہے۔ ایران میں اس جگہ ۔۔۔ اقطاع کا لفظ ہے یعنی وہ قطعہ، زمین یا گاؤں جو بادشاہوں یا نوابوں کی طرف سے دیا جائے۔

جاگیردار۔۔۔ (مذکر) سے مراد جاگیر کا مالک یا تعلقدار کے ہیں۔[۴]

فیوڈل ازم اس معاشرے میں پیدا ہوتا ہے کہ جس کی معیشت زراعت پر ہو اس میں زمین کو جاگیروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور کسانوں کی حیثیت رعیت کی ہوتی ہے۔ اس نظام میں جاگیردار سیاسی، مذہبی اور معاشی دباؤ سے پیداوار کی زائد مقدار ہتھیا لیتا ہے لہٰذا فیوڈل ازم میں فیوڈلز اور کسان کے رشتے اور زمین کی پیداوار کا استحصال اہم عناصر ہیں۔

یورپ اور ہندوستان کے فیوڈل ازم میں یہ فرق تھا کہ یورپ میں کسان مکمل طور پر فیوڈل لارڈ پر انحصار کرتا تھا۔ جب کہ ہندوستان کا کسان فیوڈل لارڈ کے بجائے اپنی پیداوار پر انحصار کرتا تھا۔ ہندوستان کے کسان کا اپنی پیداوار پر اختیار تھا اور وہ کم سے کم آمدنی پر اپنا گزارا کر سکتا تھا اگرچہ اس سے زائد مقدار لگان اور ٹیکسوں کے ذریعہ لے لی جاتی تھی مگر اس کی کم ضروریات اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے وہ اپنا وجود برقرار رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے پیداواری ذرائع کو تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت و خواہش محسوس نہیں ہوئی۔[۵]

برصغیر پاک وہند میں جاگیرداری نظام اور جاگیردار طبقہ ہندو راجاؤں کے عہد سے موجود تھا۔لیکن ذات پات کی سخت تقسیم کی وجہ سے ہندوسوسائٹی میں جاگیرداروں کے اختیارات برہمنوں کو حاصل تھے اس لیے زراعت کھیتی باڑی کے شعبوں میں جاگیرداروں کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی۔[6] لیکن اس نظام کو عروج مغل دور حکومت میں حاصل ہوا۔بابر کی ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کے حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کے محرکات چار تھے۔ ملک کی وسعت، زمین کی زرخیزی، سونے چاندی کی فراوانی اور ہنرمندوں کی افراط۔۔۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں یہ چار عناصر موجود ہوں وہاں عیش و راحت کے سامان فراہم کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔[7]

بابر (۱۵۲۶ء۔۱۵۳۰ء) نے ہندوستان کی فتح کے بعد سلاطین کی روایات کو برقرار رکھا اور امراء کو مفتوحہ زمین بطور اقطاع دیں جبکہ جاگیر اس مقصد کے لیے دی جاتیں کہ جاگیردار مرکزی حکومت کو فوج فراہم کرے۔مغل سلطنت میں جاگیردارانہ نظام کا عروج جلال الدین اکبر کے دورِ حکومت (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) سے شروع ہوتا ہے۔ ہمایوں کا دور حکومت (۱۵۳۰ء۔۱۵۵۵ء) اتنا طویل نہ تھا کہ اس نظام کو مضبوط کر سکتا لہٰذا جاگیردارانہ نظام کی تشکیل نو اکبر کے زمانہ میں ہوئی اکبر کے دور میں جاگیر، انتظامیہ کی تشکیل میں ایک اہم عنصر بن گئی کیونکہ اکبر کے منصب داری نظام میں فوجی اور منتظم دونوں کو تنخواہ کے عوض جاگیر دی جاتی تھی۔ اس لئے یہ جاگیر، تنخواہ جاگیر یا تنخولہ جاگیر کہلاتی تھی۔ جاگیر کی مختلف اقسام کے حوالے سے اطہر علی لکھتے ہیں:

> وہ جاگیریں کہ جن کے ساتھ کوئی شرط نہیں ہوتی تھی وہ 'انعام' کہلاتی تھیں وہ جاگیر جو کسی اور کو دی گئی ہوتی لیکن وقتی طور پر بادشاہ کے ملازمین اس کی نگرانی کر رہے ہوتے وہ 'پائے باقی' کہلاتی تھیں خالصہ جاگیر بادشاہ اور شاہی خاندان کے اخراجات کے لیے ہوتی تھی۔ بادشاہ زرخیز اور عمدہ زمین کو خالصہ جاگیر میں شامل کرتے۔ یہ وقت اور حالات کے ساتھ ذیادہ یا کم ہوتی رہتی تھیں ضرورت کے وقت ان میں سے منصب داروں کو بھی زمین دی جا سکتی تھی[8]

مغل دور میں جاگیردارانہ نظام مخصوص طریقہ کار کے تحت پروان چڑھا جاگیروں سے ٹیکس اور ریونیو کی وصولی کے لیے بڑے جاگیردار، عامل مقرر کرتے جو ''کروڑی'' کہلاتے تھے جبکہ عام جاگیردار کا گماشتہ عامل ہوا کرتا تھا یہ تعلقدار بھی کہلاتا تھا۔ جاگیر میں اہم عہدے داروں سے متعلق بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ فصل پر مالیہ کا اندازہ لگانے والا ''امین'' کہلاتا، ''فوطہ دار'' خزانچی ہوتا جبکہ ''کارکن'' حساب کتاب رکھتا تھا کبھی ایک ہی شخص کو دو عہدے بھی مل جاتے تھے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ عامل مقامی نہ ہوں۔ تاکہ وہ اپنی برادری ذات یا خاندان کے لوگوں سے جانب دارانہ سلوک روا نہ رکھے۔ جاگیردار، عامل سے جو رقم لیتا وہ ''قبض'' کہلاتی اور ایسے عامل کو ترجیح دی جاتی جو ذیادہ ''قبض'' دیتا تھا۔[9]

جاگیردار یہ بھی کرتا تھا کہ عامل سے پیشگی قبضہ لے کر اسے جاگیر پر بھیجتا تھا کہ وہ ریونیو وصول کرے عامل اس صورت میں اپنی رقم کو معہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے کسان پر سختی کرتا تھا۔[10]

جاگیرداروں کے امور پر نظر رکھنے کے لیے ریاست کی طرف سے کچھ عہدے دار مقرر کیے جاتے تھے یہ نہ صرف اس بات کا جائزہ لیتے کہ جاگیردار کسان سے ذیادہ ریونیو تو نہیں لے رہا اور اس کا سلوک کسانوں سے کیسا ہے؟ اہم عہدے داروں میں قانون

گو، فوجدار اور قاضی شامل تھے قاضی خود مختار عدالتی اختیارات رکھتا تھا اس کے علاوہ واقعہ نویس اور سوانح نویس، جاگیردار سے متعلق تمام معاملات اور حالات سے دربار کو آگاہ رکھتے تھے۔ مرکزی حکومت اس بات کو مدِنظر رکھتی تھی کہ ریونیو کی وصولی ان کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہو اور کسان پر ظلم نہ ہو۔[۱۱]

کسان ہمیشہ زمین دار کا ساتھ دیتے تھے کیوں کہ ان دونوں کا تعلق براہ راست تھا جبکہ جاگیردار اور بادشاہ ان کے لیے اجنبی تھے یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی سختی کے باوجود زمین دار کی طاقت قائم رہتی تھی وہ کسان کا محافظ اور سرپرست تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمین داروں کی بغاوتوں کو اکثر بڑی سختی اور بے رحمی سے کچل دیا گیا۔

برصغیر پاک وہند کی شاعرانہ روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ شعراء کی تخلیقات اپنے زمانے کی نہ صرف عکاسی کرتی ہیں بلکہ خاص واقعات اور ہر عہد کے متعلقات کو بھی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اس ضمن میں امیر خسرو کی مثنویات مثلاً ''خزائن الفتوح'' وغیرہ ایسی ہیں کہ ان سے زمانے کی سماجی تاریخ اخذ کی جاسکتی ہے اسی طرح میر'سودا' قائم چاند پوری اور دیگر شعراء نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی بھر پور عکاسی کی ہے۔[۱۲]

اکبر کا عہد، جو سلطنت مغلیہ کا دورِ عروج خیال کیا جاتا ہے کئی اعتبار سے زوال کا باعث بنا۔ یہاں سب سے بڑھ کر جس فتنے نے سر اُٹھایا وہ ''دربار اور امراء کی فضول خرچیاں نمود و نمائش اور عیش کوشیاں تھیں''۔[۱۳]

بادشاہ اور امراء کی فضول خرچی اور زیادہ سے زیادہ دولت کی ہوس نے کمزور عوام پر مظالم میں اضافہ کر دیا، رشوت اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کا دور دورا ہوا جس نے اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا ان تمام منفی اقدامات کا براہِ راست اثر عوام پر ہوا جو بادشاہِ وقت کے زیرِعتاب آ گئیں اس کے نتیجے میں حکمرانوں نے بھی عوام کے دلوں میں اپنے لیے نفرت اور بیزاری کے بیج بو دیئے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بعد محمد اعظم بہادر شاہ اول تخت نشین ہوا یہ وہ دور تھا جب مغل سلطنت میں انتشار شروع ہو گیا اس حوالے سے ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

> ''ایک طرف لوگ باہمی تعلقات اور رشتوں کے آداب بھولنے لگے تھے تو دوسری طرف حاکموں کے ذہن میں عدل و انصاف کا کوئی تصور نہ رہا تھا ظلم قانون بن گیا تھا اور ہنرمندوں کے دربدر رسوائی کے ساتھ پھرنے کا دور شروع ہو گیا تھا''۔[۱۳]

انہیں مسائل کو جعفر زٹلی نے ''دراحوال دنیا و اہل دنیا'' کے زیرِعنوان اس طرح بیان کیا ہے لکھتے ہیں:۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائی میں وفاداری محبت اُٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

فرخ سیر (۱۷۱۳ء) کے عہد میں ہر طرف عدم اعتماد کی فضا تھی خان آرزو نے فرخ سیر کا ملازم ہونے کی بناء پر اُس عہد کے معاشرتی اور سیاسی رنگ کو اُجاگر کیا ہے:۔

داغ چھوٹا نہیں، یہ کس کا لہو ہے قاتل　　ہاتھ بھی دُکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

محمد شاہ کی عیاشیوں نے امراء اور وزراء کے ساتھ عوام کے حوصلے بھی بلند کر دیئے دہلی ارباب نشاط کا مرکز بن گئی اخلاقی بے راہ روی اور بے جا اسراف نے اقتصادی بدحالی کو جنم دیا خزانہ خالی ہو گیا اور فوج کو تنخواہ دیر سے ملنے لگی ۔ اس اخلاقی انحطاط اور معاشی و اقتصادی بدحالی کے اثرات اُس دور کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں ۔ میر وسوداؔ کے شہر آشوب اور ہجویات میں اُس عہد کا المیہ اور طنز صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔شاکر ناجی، محمد شاہ کے عہد میں امیروں اور افواج کی بزدلی اور پست ہمتی کا خاکہ شہر آشوب میں بیان کرتے ہیں ۔ شاہ حاتم اپنی ''مخمس شہر آشوب'' میں محمد شاہ کے عہد کی معاشرت اور اخلاقی پستی کا نقشہ کھینچتے ہیں:

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں　　امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں

بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں　　تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں

گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

سوداؔ نے اپنی دو طویل شہر آشوب جن میں سے ایک قصیدے اور ایک مخمس کی شکل میں ہے ملک کی معاشرتی حالت، عام بے روزگاری اور معاش کے فقدان کا نوحہ بیان کیا ہے اس کے بعد سوداؔ نے بے روزگاری کے اسباب پر بحث کی ہے ۔ جو پہلے جاگیردار اور امراء تھے، ملکی بدنظمی اور افراتفری میں خود تنگ دست ہو گئے لیکن پرانے مناصب اور ظاہری رسوم وہی ہیں مگر کھوکھلے ۔۔۔

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کا ہے یہ خیال　　ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال

خزانہ خالی ہو چکا ہے فوجیوں کو تنخواہ نہیں ملتی اور وہ نوکریاں چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں جو فوجی باقی تھے ان کی بزدلی کا یہ عالم تھا:

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے　　رکھیں وہ فوج جو بھاگی پھرے لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے　　سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے

کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

جاگیردارانہ ماحول کے پس منظر میں شعراء نے ہجویات کے ذریعے بھی اپنے عہد کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی برائیوں پر طنز کی ہے۔سودا کا قصیدہ ''تضحیک روزگار'' اگرچہ ایک بخیل امیر کے فاقہ زدہ گھوڑے کی ہجو ہے لیکن درحقیقت یہ فوجی نظام کی خرابی کی طرف اشارہ ہے:

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں!　　فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بہ خبر فنا　　ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار!!

میر تقی میر نے اپنی دو شہر آشوبوں ''درہجو لشکر'' اور ''درحال لشکر'' میں طنز کے پیرائے میں بادشاہ امراء اور لشکروں کی حالتِ زار کا مرقع کھینچا ہے:

جس کسی کو خدا کرے گمراہ　　آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ

یاں نہ کوئی وزیر ہے نہ شاہ　　جس کو دیکھ سو ہے بحال تباہ

طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ (درہجو لشکر)

دہلی کی اس جاگیردارانہ فضا میں جہاں سلاطین و امراء کی بدنظمی اور بے جا اسراف سے اقتصادی بدحالی اور معاشی پریشانیوں نے اخلاقی اقدار تک پامال کر دیں شعراء اپنے شعروں میں گردشِ تقدیر پر نوحہ گر تھے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی　　چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں　　تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

(میر تقی میرؔ)

سنتا نہیں کسی کا کوئی دردِ دل کہیں　　اب تجھ سوا میں جا کر خدایا کہاں کہوں

باغ جہاں میں آ کر کچھ ہم نے پھل نہ پایا　　اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں پھپھولے

(مرزا رفیع سوداؔ)

یہی صورت ہمیں مصحفی انشاء اور دیگر دہلوی شعراء کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے ملک کی اندرونی بدنظمی کو سب قرار دے کر اودھ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سیاسی انحطاط کا شکار ہونے کے باوجود سارے شمالی ہندوستان میں اودھ ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں لوٹ مار اور غارت گری کا گزر نہیں ہوا۔ شجاع الدولہ کے عہد سے اس کی حفاظت کا ذمہ انگریزوں نے لے لیا تھا۔

اودھ کے حکمران انگریزوں کے دست نگر تھے لیکن بادشاہِ دہلی سے انہوں نے آزادی حاصل کر لی تھی جسے وہ اپنی قوتِ بازو کا ثمر خیال کرتے تھے۔ خود مختاری کا یہ زعم خواہ کتنا ہی مغالطہ آمیز کیوں نہ ہو لیکن لکھنوء کے عوام میں دہلی کی ہم سری کا جذبہ اپنی کار گزاری پر اعتماد کی بدولت پیدا ہوا بعض ناقدین کے خیال میں:

''انگریزی سلطنت کا ایک بڑا اُصول یہ رہا کہ دہلی کی مرکزیت کو کمزور کرنے کے لیے لکھنو کی اس ریاست کو زیادہ سے زیادہ خوش حال اور فارغ البال بنایا جائے''۔[۱۴]

نواب جاگیرداروں کے زیر اثر اودھ میں تعیش پسندی کا رجحان پروان چڑھا شجاع الدولہ عورتوں کا خاص طور پر شائق تھا۔ واجد علی شاہ کے پاس خوبصورت لڑکیوں کی ایک زنانی فوج بھی تھی، طوائفوں کے مجرے، ناز برداری، عزاداری یہ سب عناصر نوابی عہد کے جاگیرداروں کی سرپرستی میں عروج حاصل کرتے ہیں جس کے اثرات اُردو شاعری نے قبول کیے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

لکھنوی شعراء اس ماحول کے ترجمان تھے جس کی رنگینوں میں وہ خود بھی سرتاپا ڈوبے ہوئے تھے ایک باشعور فنکار کی طرح اس سیلاب عشرت کا رُخ موڑنے کی بجائے وہ تنکوں کی طرح بے دست و پا اس کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے۔[۱۵]

شعرائے لکھنو جس تہذیب و معاشرت کو دل و جان سے عزیز سمجھتے تھے اس کے مصنوعی ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان میں قوت وسکت نہیں وہ ایک قفس میں ہیں لیکن یہ ان کے لیے بادۂ عیش اور مئے نشاط ہے۔

عرش پر ہے ان دنوں اہل دنیا کا دماغ کون سا گھر ہے نہیں ہے جس میں بالا خانہ آج

(آتشؔ)

لکھنو میں رنج و غم سے کب کسی کو کام ہے پُر مئے عشرت سے ہے جام گدائے لکھنو

(میرؔ)

انگریزوں کی بالادستی کی بدولت سلاطین اودھ اور جاگیردار سیاسی قوت کے چھن جانے پر نادم نہ تھے بلکہ خود کو ذمہ داریوں کے بوجھ سے فارغ البال تصور کرتے اور اپنی لاغری اور ناطاقتی پر فخر کرتے تھے:

لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اُڑ گیا میرے پیکر میں ہے عالم کاغذ تصویر کا

(ناسخؔ)

ہم سے کاوش کر کے کیا ہاتھ آئے گا اے آسماں مالکِ طبل و علم نے صاحب جاگیر ہم!!

(رندؔ)

قلبی حالت اور عشق کی واردات کا بیان لکھنو کی عشرت پسند فضا کا طرۂ امتیاز رہا۔ اسی رجحان نے معاملہ بندی کو عروج عطا کیا جس میں ابتذال نے سطحی رنگ پیدا کیا۔ لکھنوی شاعری عریانی اور فحاشی کے دائرے میں شامل ہوگئی جہاں عشق اور ہوس ایک ہی جذبے کے دو نام ہو گئے۔ ریختی میں عورتوں کی زبان سے لکھنوی معاشرت ،اقتصادی صورتحال، حکومت کی بدنظمی، رشوت کی فراوانی، عدل و انصاف کا فقدان غربت و افلاس کی حکمرانی کو بیان کیا گیا۔ اس میں سعادت یارخان رنگینؔ اور انشاء اللہ خان انشاء نے بہت شہرت حاصل کی۔ جبکہ غزل سطحی موضوعات کے بیان کی وجہ سے بلند معیار سے گر گئی:

بال ہیں بکھرے، بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا ہے جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے

(جرأتؔ)

ترے کوچے میں اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

(مصحفیؔ)

لے کے میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

(انشاءؔ)

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

(آتشؔ)

لکھنو کی عیش پرست ،رنگین اور رومانوی فضا مثنوی کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی اس میں بھی معاشرے کے مزاج کی

عکاسی کی گئی اس ضمن میں میر حسن کی ''سحر البیان'' (۱۷۸۴ء) ، دیاشنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' ، مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' (۱۸۶۰ء) ، فریب عشق، بہار عشق اور لذت عشق بطورِ خاص اہم ہیں۔

جاگیر دار سلاطین کی سر پرستی سے لکھنو میں مرثیہ بھی پروان چڑھا اس کا سب سے بڑا سبب سلطنت اودھ کے حکمرانوں کا شیعہ مسلک سے تعلق تھا فروانروان اودھ انگریزی حکمت عملی کی گھٹن سے فرار حاصل کرنے کے لیے بھی مجالس عزاداری کا اہتمام کرتے جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

یوں بھی عیاش لوگوں کے لیے شہادت کے اس پُر درد واقعہ کا سوگ منانا نفسیاتی لحاظ سے بھی تسکین کا باعث بنتا ہوگا۔[۱۶]

لکھنو کے اہم مرثیہ نگاروں میں مظفر حسین ضمیر، میر زاد بیر، میر انیس اور میر مونس شامل ہیں۔

واسوخت نے بھی لکھنو کی عیش وعشرت، لہو ولعب، محبوب کی بے وفائی اور اس پر عاشق کا طنز جیسے موضوعات کو بیان کیا ۔ لکھنوی شعراء میں جرأت، بحر اور بطور خاص امانت لکھنوی نے واسوخت میں نام پیدا کیا امانت کی واسوخت واجد علی شاہ کے دور کی آئینہ دار تھیں:

میں ادھر لوٹوں مزے وصل کے بے خوف وخطر ‌‌‌‌ ‌ تو اُدھر غم سے تڑپتا رہے بادیدۂ تر
دیکھ کر گرمی صحبت کو جلے جسم و جگر ‌ آتش رشک جلائے تجھے انگاروں پر
رات بھر تنگ یہ دل گردش افلاک کرے ‌ صبح کے ساتھ گریباں کو تو چاک کرے

گویا دبستان لکھنو میں جاگیرداروں کی عیش پرستی اور حقیقت سے فرار کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں اورعوام کی طرف سے ان کی بے اعتنائی اور سرد مہری بھی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

جاگیرداری نظام کا عروج مغل دورِ حکومت کے عروج کے ساتھ نظر آتا ہے اور مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہوتا ہے۔ جبکہ انگریزوں نے بھی بعدازاں اپنے مفادات کی خاطر جاگیرداروں کی سرپرستی کی۔

جاگیرداری نظام میں ادب نواز سلاطین و امراء بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ شعراء کی دربار میں پذیرائی کی جاتی انعام اور مراعات سے نوازا جاتا جبکہ شعراء بھی بادشاہ اور امراء کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کے مزاج کے موافق شاعری کرتے۔ جبکہ دوسری طرف شاعری میں سلاطین کے بے جا اسراف ، عیش وعشرت کا سامان، فوج کی حالت ،بدنظمی، لاقانونیت، عوام کے مسائل، معاشی صورت حال غرض جاگیرداری نظام میں درباری اور عام معاشرتی مزاج کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے جس نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو شاعری کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ بھی کیا اور اس عہد کی تاریخ بھی رقم کی۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر مبارک علی، جاگیرداری، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔ص۹

۲۔ ایضاً،ص۱۵

۳۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۷)، لاہور: دانش گاہِ پنجاب، طبع اول ۱۹۷۱ء۔ص ۳۷

۴۔ مولوی نور الحسن نیر مرحوم، نور اللغات (حصہ اول)، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم ۲۰۰۶ء، ص۱۱۸۱

۵۔ T.J. Byres and Harbans Mukhia (Editors): Feudalism and Non-European Societies. London 1985, P-275

۶۔ شیخ نیاز احمد (طابع)، اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء، ص۴۴۳

۷۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، ص۲۱۰، ۲۱۱

۸۔ Athar Ali, Mughal Nobility under Aurangzeb, Bombay: 1970, P-74

۹۔ ڈاکٹر مبارک علی، جاگیرداری، ص۷۶

۱۰۔ Athar Ali: Mughal Nobility under Aurangzeb, P-82,90

۱۱۔ ڈاکٹر مبارک علی، جاگیرداری، ص۷۷

۱۲۔ پروفیسر سحر انصاری، نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری ...... سماجی تاریخ کا ایک ماخذ، مضمون مشمولہ سہ ماہی تاریخ، ایڈیٹر ڈاکٹر مبارک علی، لاہور: تھاپ پبلی کیشنز، مئی ۲۰۱۲ء، ص۹

۱۳۔ ابوالخیر کشفی، اُردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر، کراچی: ادبی پبلشرز، اگست ۱۹۷۵ء، ص۱۱۰

۱۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تنقیدی مقالات، مرتبہ مرزا ادیب، لاہور: لاہور اکیڈمی ۱۹۶۳ء، ص۱۷۵

۱۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، ص۳۴۸

۱۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص۱۲۲